ساجد حمید

نظم قرآن کیا خارج سے ماخوذ ہے؟

مدرسۂ فراہی کے تصورِ نظم قرآن سے متعلق یہ سوال بہت اٹھایا جاتا ہے کہ یہ قرآن کے کلام میں موجود ہے یا خارج سے کلام الٰہی میں ڈالا جا رہا ہے؟ ذیل کی سطور میں اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سوال کا مختصراً جواب تو یہ ہے کہ مدرسۂ فراہی کا تصورِ نظم قرآن خارجی نہیں، بلکہ یہ قرآن کے کلام ہی سے ماخوذ ہے۔ اب اس کو تفصیل سے سمجھتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مقدر مقدمات

مولانا فراہی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ قرآن فہمی میں رکاوٹ مقدر مقدمات کو نہ سمجھنے میں ہے[1]۔ یہی بات دراصل نظم قرآن کے تصور کا خلاصہ ہے۔ پہلے مولانا کے اس جملے کو سمجھتے ہیں۔ مقدر سے مراد وہ بات ہے جو کلام کے پس منظر میں موجود ہوتی ہے، مگر لفظوں میں بیان نہیں ہوتی۔ مقدمہ اس بات کو کہتے ہیں جس کی بنیاد پر باتیں کی جاتی ہیں۔ جیسے باپ کا بیٹے کو یہ کہنا کہ سچ بولو، یہ اس مقدمے پر قائم ہے کہ ''سچ بولنا اچھائی ہے''۔ یہ مقدمہ اگر موجود نہ ہو تو باپ کے اس حکم میں کوئی جان نہیں ہے۔ ''سچ بولو'' کے اس جملے میں ''سچ اچھا ہے'' ایک مقدر مقدمہ ہے۔ ہماری تمام باتیں مقدر مقدمات پر قائم رہتے ہوئے ہی کہی اور سمجھی جاتی ہیں۔ انھیں عموماً بولا نہیں جاتا۔

جب بھی ہم کوئی بات کہتے ہیں تو وہ معاشرے، عقل، تجربے، تصورات، تہذیب اور دین وغیرہ میں موجود کچھ

---

[1] حجج القرآن ۲۷۔ واضح رہے کہ نظم کے داخلی ذرائع میں اور بھی پہلو ہیں، مگر یہاں صرف مقدرات پر بات کرنا پیش نظر ہے، اس لیے کہ یہ بنیادی چیز ہے۔

مقدمات (باتوں) پر قائم ہوتی ہے۔ مثلاً جب برصغیر پاک و ہند میں ایک بیوی اپنے شوہر کو یہ آواز دیتی ہے کہ 'راستہ بدل لو، کالی بلی راستہ کاٹ گئی ہے' تو ''راستہ بدل لو'' جملے کا ''کالی بلی راستہ کاٹ گئی ہے'' سے کوئی تعلق اس وقت تک واضح نہیں ہوتا، جب تک کہ ہم یہ مقدر نہ کھولیں کہ 'کالی بلی کا راستہ کاٹنا منحوس سمجھا جاتا ہے'۔ تو گویا دونوں جملوں کا ربط اس توہّم پر مبنی ایک مقدر تصور کے جاننے پر منحصر ہے۔ اسی طرح غالب نے جب یہ کہا کہ:

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

تو اس شعر کے دونوں مصرعوں کا باہمی تعلق ایک مقدر مقدمے پر قائم ہے، وہ مقدر مقدمہ سیدنا عیسیٰ کی مسیحائی ہے۔ اگر کوئی شخص اس مقدر سے واقف نہیں ہوگا تو شعر کا نہ مضمون سمجھ سکے گا اور نہ اس سے حظ اٹھا سکے گا، کیونکہ دونوں مصرعوں کا ربط ہی اُس پر نہیں کھلے گا۔

فراہی مکتبِ فکر انھی مقدرات کے کھولنے کو نظم کلام کہتا ہے۔ یہ مقدرات اگرچہ لفظوں میں موجود نہیں ہوتے، مگر کلام ان پر استوار ہوتا ہے۔ روزمرہ کی گفتگو ہو، یا علمی و تحقیقی مقالات ہوں، انھی مقدرات پر اپنے معنی پاتے، اور باتوں کو مربوط کرتے ہیں۔ ان مقدرات کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ آفاقی مقدمات، جو تمام انسانوں کے تصورات میں موجود ہیں۔ مثلاً (ذہنی) سچ بولنا اچھائی ہے، (حسی) آسمان نیلا ہے۔ جیسے ''گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا''، میں گنبد نیلوفری سے مراد آسمان ہے۔

۲۔ علاقائی مقدمات، جو ایک علاقے میں تو موجود ہوں، مگر باقی دنیا ان سے ناواقف ہو۔ مثلاً اردو شعر کی روایت میں ستم زدہ عاشق کے رونے سے سیلاب آسکتے ہیں جس سے گھر اور بستیاں ویران ہوسکتی ہیں، جیسے:

گر یونہی روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں
غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کیے ہوئے

یہ علاقائی مقدرات پھر دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ اس علاقے کے آفاقی، جیسے ہندوستان میں ذات پات میں برہمن کا تقدس اور شودر کا تذلل۔ یا مثلاً برہمن کا غیب گو ہونا، غالب نے اس سے مضمون باندھا ہے:

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض!
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

۲۔ متکلم کے خود ساختہ مقدمات جسے وہ مقدار کی حیثیت سے استعمال کرے۔ جیسے علامہ اقبال کا تصورِ خودی، لیکن مقدر کے طور پر استعمال کے لیے شاعر کو اسے متعارف کرانا پڑتا ہے۔ اقبال نے اپنے اس تصور کا اپنی شاعری میں خوب تعارف کرایا ہے، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ تصور نیا ہے، لوگ اسے سمجھ نہیں سکیں گے، لہٰذا وہ مختلف پیرایوں سے اسے بیان کرتے ہیں، ہمارے عہد کے بعض شعرا نے علامتی شاعری کی ہے، لیکن وہ اپنی علامتوں کو متعارف نہ کرا سکے، اس لیے علامتی شاعری ان کے حلقوں سے باہر نہ نکل سکی۔

اب اصول یہ سمجھیے کہ مقدرات دراصل وہ تصورات ہیں جو کلام میں کہی گئی باتوں میں مقدمات کا کردار ادا کرتے ہیں، جن پر معنی کا دارومدار ہوتا ہے۔ یہ مقدرات جس قدر معروف ہوں گے اسی قدر کلام واضح دوٹوک اور دلالت میں صریح ہوگا۔ لیکن بعض اوقات یہ مقدرات غیر اہل زبان کے ہاں مختلف ہونے کی وجہ سے رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ مثلاً اردو میں 'برسات کا دن' مضمون لکھنے کو دیا جائے تو یہ دل پسند اور خوب صورت وقت کا بیان ہوگا، لیکن انگریزی کا rainy-day مصیبت کے لیے معروف ہے۔ اب جس کو اس کا پتا نہیں ہوگا، اس کے لیے اس جملے saving money for a rainy day کا مطلب ہوگا کہ پیسہ جمع کر کے برسات کے دنوں میں عیش کریں گے، حالاں کہ انگریز یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں ایمرجنسی کے لیے روپے جمع کر رہا ہوں۔ لہٰذا غیر زبان کے بعض مقدرات نا معلوم ہونے کی وجہ سے کلام غیر مفہوم رہ سکتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو مولانا فراہی نے لکھی ہے کہ کلام کے مقدر مقدمات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے قرآن فہمی میں رکاوٹ رہی ہے۔

مقدر کلام کے دروبست سے بھی پیدا ہو جاتا ہے[۲]۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پہلے اہل زبان کے ہاں معروف نہ ہو، لیکن جب وہ معروف سے چھوٹا ہوگا تو فوراً سمجھ میں آئے گا، اور اگر معروف سے نہیں چھوٹا ہوگا تو مختلف فیہ ہو جائے گا، لہٰذا کلام مبہم یا زیادہ غور کا محتاج ہو جائے گا۔ اسی عمل سے لسانی ارتقا ہوتا ہے اور الفاظ اپنے دامنِ معنی کو وسیع کرتے جاتے، اور بعض معانی کو اپنے دامن سے نکال پھینکتے رہتے ہیں۔ کلام کے دروبست سے پیدا ہونے والے مقدر کو ذیل کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں:

میں کلاس میں داخل ہوا، طالب علم شور مچا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سب احتراماً خاموش ہو کر اپنی نشستوں پر

۲۔ آگے قرآن سے دی گئی مثالوں میں 'وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا'، والی آیات اسی نوع کی مثال ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بیٹھ گئے۔ پھر میں پڑھانے لگا۔

اس کلام میں واحد متکلم کو آخری جملے نے استاد کی حیثیت دے دی ہے۔ یہ مقدر کلام کے دروبست نے پیدا کیا ہے۔ اب اگر میں اس کی شرح میں لکھ دوں کہ استاد نے ایسا کہا تو غلط نہ ہوگا۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اوپر خط کشیدہ میں اور ''احتراماً'' اور ''پڑھانے'' کا ربط واضح نہیں ہوگا۔

مختصر یوں کہیے کہ ہمارے ذہنوں میں کچھ مانے اور جانے بوجھے تصورات ہوتے ہیں، جن کو ذہن میں رکھ کر ہم بات کرتے ہیں، لیکن ان کو لفظوں میں نہیں بتاتے۔ ایسی باتوں کو مقدرات کہتے ہیں، کلام کے معنی کا بڑا انحصار انھی کے علم و دریافت پر کھڑا ہوتا ہے۔ عرب اپنے مزاج میں عجمیوں سے زیادہ مقدر مقدمات پر انحصار کرتے ہیں۔ ان کے کلام کا یہ وصف 'خیر الکلام أقل و أدل'، ان کے کلام کو دنیا سے ممتاز کرتا ہے۔ قرآن بھی انھی کے اسلوب میں اترا ہے۔ ایسے کلام میں مقدرات کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایسا کلام اعلیٰ ترذکاوت اور ژرف نگاہی کا تقاضا کرتا ہے۔ عجمیوں کا یہ مزاج نہیں تھا، اس لیے انھیں قرآن غیر مربوط دکھائی دیتا رہا، کیونکہ دو جملوں کو جوڑنے والے مقدرات ان پر منکشف نہیں ہوئے تو وہ کلام کے ربط کو نہ پا سکے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

انھی مقدرات کے تحت تعلیل، تقابل، اصل، فرع، اعتراض اور استدراک وغیرہ کے تعلق کلام میں پیدا ہوتے اور معنی آفرینی کرتے ہیں۔

معنوی بندھن اور مقدرات

محذوف مقدرات کے بعد دوسری اہم چیز کلام کے معنی کے بندھن میں ان مقدرات کا کردار ہے۔ درج ذیل مثال پر غور فرمائیں:

- ماں نے بیٹے سے کہا: بہت گرمی لگ رہی ہے۔

بیٹے کی طرف سے چند ممکنہ جوابات یہ ہو سکتے ہیں:

- امی، اے سی چلا لیں۔
- سورج نے تو جلانے کی قسم کھا رکھی ہے۔
- ہاں گرمی تو جانے کا نام ہی نہیں لے رہی۔

یہ جوابات ماں کی بات سے واضح طور پر مربوط ہیں۔ کسی کو ان کے ربط سے انکار نہیں ہوگا۔ لیکن ماں کی اسی بات

کہ بہت گرمی لگ رہی ہے کے جواب میں ذرا بیٹے کے ان جملوں پر توجہ دیجیے:

o امی، ابھی آیا۔

o امی، ذرا انتظار کریں، نہا رہا ہوں۔

o اماں، فرج خراب ہے۔

یہ جوابات بظاہر غیر متعلق ہیں، لیکن ایک مقدر مفہوم پر منحصر ہیں، اس لیے بظاہر غیر متعلق ہوتے ہوئے بھی عین متعلق ہیں۔ ماں نے جب کہا کہ گرمی لگ رہی ہے تو بیٹے نے یہ سمجھا کہ والدہ کہہ رہی ہیں کہ آ کر میرا پنکھا چلا دو، یا مجھے ٹھنڈا پانی دو۔ تینوں جملے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر جواب میں کہنے ممکن ہیں۔ اگر والدہ کے اس جملہ کہ گرمی لگ رہی ہے، میں یہ مقدر نہ مانا جائے کہ والدہ پنکھا چلانے یا ٹھنڈا پانی مانگ رہی ہیں تو یہ تینوں جواب غلط ہیں۔ بیٹے نے اس سادہ جملے میں مقدر معنی کو محسوس کیا ہے، اس لیے اس کے احساس کے مطابق اس نے نہایت متعلق باتیں کہی ہیں۔ لیکن جو اس جملے کا یہ مقدر نہ سمجھے، وہ بیٹے کو بے وقوف سمجھے گا کہ کس طرح کے غیر متعلق جواب دیے جا رہا ہے۔ لہٰذا مقدر مفاہیم دو باتوں کے درمیان بندھن کا کام کرتے ہیں، جو بظاہر مختلف یا غیر متعلق ہوتے ہیں۔

یہ بندھن کئی پہلوؤں سے ہو سکتا ہے۔ ہم یہاں چار عمومی طور پر ممکن مقدرات کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

۱۔ مفہوم، جملہ جس بات کو کہنے کے لیے بولا گیا ہے۔ مثلاً ماں نے بیٹے سے کہا: بہت گرمی لگ رہی ہے، کا جملہ موسم کی حالت کا پتا دے رہا ہے۔ (اس میں مقدر یہ ہے کہ والدہ صرف موسم پر تبصرہ کر رہی ہیں)۔

۲۔ مدعا: جملہ جس بات کو سامع تک پہنچانا چاہتا ہے۔ مثلاً اس جملے میں ماں بیٹے کو کہنا چاہتی ہے کہ گرمی ہے پنکھا چلا دیا جائے، یا ٹھنڈا پانی پینے کو دیا جائے وغیرہ۔ (اس میں مقدر یہ ہے کہ والدہ گرمی کا کہہ کر کچھ مطالبہ کر رہی ہیں)۔

۳۔ نتائج: کہی گئی بات کے کچھ نتیجے نکلیں گے۔ مثلاً یہ کہ موسم خوشگوار نہیں ہے، باہر جانا آسان نہیں ہے، ماں تکلیف میں ہے، وغیرہ۔ (اس میں مقدر یہ ہے کہ والدہ موسم کا کہہ کر کسی کام سے روکنا چاہتی ہیں، یا کچھ نتائج کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہیں)۔

۴۔ تقاضا: اس جملے کے کچھ تقاضے پیدا ہوں گے۔ مثلاً پنکھا فوراً چلنا چاہیے، ماں کی تکلیف زائل ہونی چاہیے، وغیرہ۔ (اس میں مقدر یہ ہے کہ مدعا پر عمل کیا جائے، نتائج کا خیال رکھا جائے، دی گئی اطلاع کو پیش نظر رکھا جائے)۔

[یہ اوپر کے تینوں مقدرات کا خیال رکھنا ہے]۔

یہ سارے معنی اس جملے کا ممکنہ حصہ ہیں جو ماں نے بیٹے سے کہا۔ اگرچہ بولے نہیں گئے۔ اب اگلے جملے ان میں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سے کسی کی رعایت کرتے ہوئے بولے جائیں تو وہ ایک ربط رکھتے ہوں گے خواہ وہ بظاہر غیر مربوط معلوم ہوتے ہوں۔

مثلاً بیٹا ماں کو کہے: اچھا میں پنکھا چلاتا ہوں، یا وہ کہے کہ ماں، بجلی نہیں آ رہی ہے، یا وہ کہے: ماں، میں نے کہا تھا نا کہ اس وقت باہر نہ جاؤ، واضح طور پر مربوط ہوں گے۔ پہلا اور دوسرا جواب تقاضے کے پہلو سے ہے، تیسرا نتائج کے اعتبار سے ہے۔ لیکن اگر بیٹا ماں سے کہے کہ میں نہا رہا ہوں، تو یہ جملہ قدرے غیر متعلق لگ رہا ہے۔ لیکن وہ بھی مربوط ہے، تقاضے کے لحاظ سے وہ کہنا چاہتا ہے کہ میں نہا رہا ہوں آپ کا پنکھا فوراً نہیں چلا سکتا۔ آپ کو کچھ انتظار کرنا ہوگا، یا خود اٹھ کر چلا لیں۔

اب غالب کے درج ذیل شعر پر اس زاویۂ نگاہ سے غور کیجیے کہ اس نے کس طرح مقدر مقدمات سے دو مصرعوں کو مربوط بنایا ہے:

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ان دونوں مصرعوں کا دور دور تک کوئی باہمی تعلق نہیں ہے لیکن اس میں ایک شاعرانہ اور دو مادی تجربے پر مبنی مقدمات مقدر ہیں۔ شاعرانہ مقدمہ یہ ہے کہ رونے سے اتنا پانی جمع ہو جاتا ہے کہ گھر غرقاب ہو جاتا ہے۔ پہلے مصرعے میں یہی مقدر مقدمہ موجود ہے۔ اگر میں نہ روتا، یعنی گھر غرقاب نہ بھی ہوتا تو تب بھی ویران ہوتا۔ دوسرے مصرعے میں دو مادی تجربے پر مبنی مقدمات کو بطور دلیل بنایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اگر سمندر سے پانی نکال دیا جائے تو باقی بیاباں ہی بچے گا۔ دوسرا یہ کہ بیاباں ویران ہوتا ہے۔ اب دونوں مصرعے نہایت مربوط ہیں، یعنی شاعر اپنے مخاطب سے کہتا ہے کہ تم مجھے کہہ رہے ہو کہ تمھارے رونے سے تمھارا گھر پانی میں غرقاب ہو کر ویران ہو گیا ہے، اگر تم نہ روتے تو گھر ویران نہ ہوتا، تو تمھاری بات درست نہیں، اس لیے کہ میرے نہ رونے سے گھر غرقاب نہ ہوتا تو تب بھی گھر ویران ہی ہوتا، اس لیے کہ یہاں اگر پانی نہ ہوتا تو ویران بیاباں ہوتا، کیونکہ بحر سے پانی نکال دیا جائے تو اس کے بعد بیاباں ہی نمودار ہوگا، آباد گھر تو برآمد نہیں ہوگا۔

لفظی مقدرات

باتوں اور جملوں کی طرح لفظ بھی مقدرات کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ جن چیزوں کے نام یا علامت ہیں، ان کے اوصاف و خصائص کو یہ مقدرات کے طور پر اپنے جلو میں لیے کلام میں چلتے ہیں۔ مثلاً پانی کا لفظ، سیال ہونے،

مشروب ہونے، آگ اور پیاس بجھانے والا ہونے، جیسے متعدد مقدرات اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اردو محاورے 'آگ پانی کا کھیل' اور 'پانی میں آگ لگانا' میں پانی اور آگ کے وہ اوصاف مقدر کا کام کر رہے ہیں جو دونوں کو مادی دنیا میں یکجا نہیں ہونے دیتے۔

بسم اللہ میں صفاتِ رحمٰن و رحیم پر اسی زاویے سے غور کریں۔ برکت و سازگاری رحمت کا ایک مقدر مفہوم ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے اس کا پڑھنا طلب برکات و سازگاری کے لیے ہے۔ قرآن مجید کی سورتوں میں سرنامے کے طور پر اس کا استعمال رحمت اور ہدایت کے اس تعلق سے ہے جو سورۂ رحمٰن میں بتایا گیا ہے کہ 'اَلرَّحْمٰنُ، عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ'۔ یہی چیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو 'رحمۃً للعالمین' کہنے میں پیش نظر ہے۔ یعنی براہِ مہربانی و خیر خواہی صحیح بات کی طرف ہدایت رحمت کا ایک مقدر حصہ ہے۔ یہاں دیکھیے کہ کس طرح رحمت اپنے مقدر مفہومات سے معنی آفرینی اور ربط کا عمل سرانجام دے رہی ہے۔ مولانا فراہی اور ان کے پہلی اور دوسری نسل کے تلامذہ انھی مقدرات کو پہچانتے اور معنی میں ربط تلاش کرتے ہیں۔ یہ ہرگز خارج سے داخل کیے گئے تصورات نہیں ہیں۔

یوں مقدرات وہ بنیادی اکائی ہیں، جن پر اجزاے کلام کا معنوی ربط قائم ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے انسانی فطرت، عرب سماج، دین ابراہیمی، عرب لسانی تصورات، اخلاقی حسن و قبح، انسان اور عربوں کے عقلی مسلمات، مادی تجربات، اور ظواہر کائنات وغیرہ پر مبنی مقدمات پر اپنے کلام کی معنویت کی بنیادیں استوار کی ہیں۔ ان کے بیچوں بیچ اس نے نئے الوہی، اسلامی، اخلاقی اور حکمت الٰہیہ کے مقدمات کو بھی متعارف کرا کے مقدرات کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اب قرآن مجید سے چند مثالیں دیکھتے ہیں۔

مولانا فراہی نے سورۂ نجم کی ایک آیت کے جملے: 'فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى' (۵۳:۳۲) پر لکھا ہے:

یعنی اپنے مزکی ہونے (یا پاکی داماں) کی حکایت اتنی نہ بڑھاؤ، کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ تم میں سے کون متقی ہے۔

تو مولانا کہتے ہیں کہ اس سے یہ واضح ہوا کہ تزکیہ دراصل تقویٰ ہے[۳]۔ آیت کے خط کشیدہ الفاظ کا موازنہ کریں۔ مولانا کی مراد یہ ہے کہ 'تُزَكُّوْا' میں تقویٰ کا مفہوم مقدر تھا، تبھی اس پر یہ جملہ بولنا مربوط ہوگا کہ وہ متقیوں کو جانتا ہے۔ میں مولانا فراہی کا حوالہ اس لیے دے رہا ہوں تاکہ یہ واضح ہو کہ میں یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا کہ نظم کلام کا داخلی جزو ہے، بلکہ اس تصور کے موجدِ اول نے یہی بات کہی ہے۔

---

[۳] رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن ۱۱۸۔

اب ایک مجموعۂ آیات کو دیکھیے کہ مولانا نے اسے کیسے حل کیا ہے:

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ. وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ. وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ. فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ. (الذاریات ۵۱: ۴۷-۵۰)

''آسمان کو ہم نے عظیم قدرت کے ساتھ بنایا ہے اور ہم بڑی وسعت رکھنے والے ہیں۔ اور زمین کو ہم نے بچھا دیا ہے، سو کیا خوب بچھانے والے ہیں۔ اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ اِس لیے دوڑو اللہ کی طرف، میں اُسی کی طرف سے تمھیں ایک کھلا خبردار کرنے والا ہوں۔''

مولانا فراہی یہ کہتے ہیں کہ اس مجموعۂ آیات میں جوڑے جوڑے بنانے کا ذکر خدا کی قدرت اور حکمت پر دلالت کر رہا ہے، پھر اس دار فانی کے تتمہ[۴] آخرت پر دلالت کر رہا ہے، اور پھر اعمال کے لیے مجازات کے تتمہ پر دلالت کر رہا ہے[۵]۔ مولانا کی بات کا مطلب یہ ہے کہ آسمان کے لیے 'بَنَيْنٰهَا' (عمارت) کا لفظ اور زمین کے لیے 'فَرَشْنٰهَا' (فرش یا زمین) کا لفظ بولا گیا، پھر کہا گیا کہ ہم نے ہر چیز جوڑا جوڑا بنائی ہے۔ تو واضح ہوا کہ زمین و آسمان عمارت اور فرش ہونے کی وجہ سے جوڑا جوڑا ہوئے۔ گویا اگر کسی جگہ صرف عمارت تو ہو، مگر نیچے زمین نہ ہو تو گھر نہ بنا، اسی طرح فرش تو ہو، مگر عمارت نہ ہو تو تب بھی گھر نہ ہوا۔ تو یوں گھر بنانے کے لیے آسمان اور زمین ایک دوسرے کے لیے تتمہ ہوئے۔ یعنی دونوں مل کر گھر تشکیل کرتے ہیں۔ پھر کلام آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر چیز کو جوڑے جوڑے اس لیے بنایا کہ تم ان سے یاددہانی حاصل کرو۔ مراد یہ کہ ہر چیز کو جوڑا اس لیے بنایا کہ تم اس کائنات پر اس زاویے سے نگاہ دوڑا کر ایک مخفی حکمت کو جانو کہ ہر چیز جوڑا جوڑا ہے۔ لیکن قرآن کی یاددہانی مادی نہیں، بلکہ روحانی ہے۔ اس لیے کلام آگے بڑھا تو کہا کہ اللہ کی طرف لپکو۔ اور اس لپکنے کی دعوت کو 'نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ' سے جوڑ کر ڈرانا قرار دیا۔ اب جب ہر چیز جوڑا ہے، اور جوڑے تذکیر کے لیے بنائے گئے، اس تذکیر سے نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کی طرف بڑھو، ورنہ مارے جاؤ گے تو کلام منہ کھول کر اعلان کر رہا ہے کہ چیزیں جوڑا جوڑا بنانے کے عمل میں کوئی خبردار ہونے کی چیز موجود ہے۔ اس سے مولانا فراہی نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ کون سا جوڑا ہے جس سے خبردار ہونا چاہیے تو قرآن کے مضامین کی روشنی میں انھوں نے زمین کے فرش اور آسمان کے عمارت ہونے جیسے دو جوڑے نکالے ہیں۔ ایک یہ کہ اس دنیا کا ایک جوڑا ہونا چاہیے جو اس دنیا کے تتمہ کا کام کرے۔ اور دوسرے یہ کہ اعمال کا تتمہ ان کی جزا و سزا ہے۔ یہ دونوں جوڑے بلاشبہ تتمہ بھی ہیں،

---

۴ Complemental Half وہ چیز جو کسی مجموعہ کو مکمل کرنے میں آدھا کردار ادا کرتی ہو یا کسی یونٹ کو مکمل کرتی ہو۔

۵ رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن ۱۱۹۔

لیکن ساتھ ہی 'نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ' کی دعوت کا حصہ بھی۔ اسے مختصراً یوں سمجھیے:

آسمان اور زمین مل کر اس دنیا کو مکمل بناتے ہیں،

یہ اس اصول پر ہے کہ ہر چیز جوڑا جوڑا ہے، جن کے ملنے سے ایک یونٹ مکمل ہوتا ہے،

جوڑا جوڑا بنایا جانا ایک نشان ہے جس سے نصیحت حاصل ہوتی ہے،

یہ نصیحت خدا کی طرف بڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔

لہٰذا جوڑوں کے اس اصول میں کوئی ایسی بات ہے جو خدا کی یاد دہانی دلوں میں ڈالتی ہے۔

اب چیزوں پر غور کریں تو ہر چیز کا جوڑا ہے، مگر اس دنیا کا جوڑا نہیں ہے۔ یعنی یہ دنیا دارالعمل ہے، لیکن دارالعمل دارالجزا کا تقاضا کرتا ہے۔ تب جا کر اس کی نیکی بدی کے شعور والے انسان کی زندگی کی معنویت مکمل ہوتی ہے۔

تو اس دارالعمل کا جوڑا دارالجزا ہونا چاہیے، یعنی آخرت۔

یہ وہ شان دار استدلال ہے جو مولانا نے ان آیات کے نظم سے کشید کیا ہے۔ اسی کو مولانا کہتے ہیں کہ نظم حکمتِ قرآن کا دروازہ ہے۔

غرض یہ کہ لفظ، جملے، پیراگراف، سورتیں اور پھر ابواب اسی طرح کے مقدرات کے ساتھ مربوط ہو کر ایک شان دار مرتب کتاب کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اس مضمون کا تنگ نائے اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ان تمام پہلوؤں پر بات ہو سکے۔ لیکن مذکورہ بالا اصول اور اس کی روشنی میں چند مثالیں امید ہے بات کو سمجھانے کے لیے مفید ہوں گی۔

اس اصول کی عملی تطبیق کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مدرسۂ فراہی کے اکابرین کی تفاسیر کو پڑھا جائے۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ کا ''مجموعہ تفاسیر''، مولانا امین احسن صاحب اصلاحی رحمہ اللہ کی ''تدبر قرآن'' اور استاذی الجلیل غامدی صاحب دامت برکاتہ کی ''البیان'' اسی نظم کی دریافت پر مبنی تفاسیر ہیں۔ ان کا اس زاویے سے مطالعہ اس بات کو مزید واضح کرے گا کہ نظمِ قرآن خارج سے قرآن کے کلام میں نہیں ڈالا گیا، بلکہ اس کے الفاظ و جمل کی دلالت اس طرف لے جاتی ہے۔ وہ زاویہ یہ ہے کہ کلام کے مقدرات کو کھول کر مربوط کرنے کا نام نظم قرآن ہے۔ ان کے علاوہ فراہی صاحب کی ''دلائل النظام'' اصلاحی صاحب کی ''مبادی تدبر قرآن'' اور استاذ گرامی کی ''میزان'' میں ''اصول و مبادی'' کا باب اور ''البیان'' کا ''خاتمہ'' بھی مفید مطلب ثابت ہوگا۔ لیکن مقدرات کے کھولنے اور نظم واضح کرنے کی عملی صورت بہرحال صرف تفاسیر ہی میں ملے گی۔

وہ تفاسیر، جو شانِ نزول، فلسفہ، منطق، تصوف اور اسلاف کی آرا پر مشتمل ہیں، وہ دراصل خارج سے متن قرآن

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کی تفسیر کرنا ہے، جب کہ ہم پیروانِ مدرسۂ فراہی، اسی معنی کو قبول کرتے ہیں، جن کو قرآن کے الفاظ، جمل اور سیاق و سباق وغیرہ اپنے معانی اور ان سے وابستہ مقدرات کے طور پر قبول کرتے ہوں۔ یہ اتنا محکم ضابطہ ہے کہ اس میں کسی مفسر کی غلطی پکڑنے اور اس کی تفسیر کی اصلاح و تصحیح کا باب ہمیشہ وا رہتا ہے۔ مثلاً اگر مولانا فراہی کسی مقدر کو غلط کھولیں اور کلام کسی اور مقدر کی طرف اشارہ کر رہا ہو تو فکر فراہی کا ایک طالب علم بھی ان سے اختلاف کر کے اصلاح کر سکتا ہے۔ اسی بات کو استاذ گرامی یوں کہتے کہ قرآن کے شہرستان معانی کا ایک ہی دروازہ ہے، اور وہ لفظ ہے۔

لیکن جب معنیِ قرآن کا فیصلہ خارج سے ہونا ہو، اور ان لوگوں کے اقوال سے ہونا ہو، جنھیں امامت کا درجہ حاصل ہو تو پھر اصلاح و تصحیح کی کوئی گنجایش نہیں رہتی۔ یہ مقام صرف رسولِ خدا کو حاصل ہے کہ ان کی بات سے چون و چرا نہ کیا جائے۔ آپ کے بعد یہ مقام کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے مدرسۂ فراہی سنتِ متواترہ کو قرآن کی حتمی تفسیر مانتا ہے۔ لیکن خبر آحاد کے بارے میں توقف اور غور و فکر کا قائل ہے، اس لیے کہ آپ سے ان کی نسبت کے ظن اور روایت بالمعنیٰ میں خطا کے امکان نے اس کا مقامِ معصومیت اس سے چھین لیا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ سنتِ متواترہ بھی لسانی تواتر کا حصہ ہے، یہ بھی خارج سے تفسیر نہیں ہے۔ جب قرآن 'اَقِمِ الصَّلٰوۃَ' کہتا ہے، تو ہم 'الصَّلٰوۃ' کے معنی پنجگانہ نماز صرف اس لیے نہیں کرتے کہ یہ سنت متواترہ میں آیا ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ عہدِ نزولِ قرآن سے تا حال 'الصَّلٰوۃ' کے لغت میں متواتر معنی یہی ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org